بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

نظرات

۱۹۵۰ء میں مصر میں ایک کتاب "مِن ھُنا ... نبدأ" (یہاں سے ... ہم شروع کرتے ہیں) شائع ہوئی جس نے بالخصوص وہاں کے دینی حلقوں میں ایک تہلکہ ڈال دیا۔ اس کتاب کے مصنف خالد محمد خالد خود بھی ازعلماء (من العلماء) تھے۔ یہ شاہ فاروق کا دورِ حکومت تھا۔ اور نجیب اور ناصر ابھی برسر اقتدار نہیں آئے تھے۔

جامع ازہر کے "حضرت صاحب الفضیلۃ رئیس لجنۃ الفتوٰی" کے فتوے کی بنا پر مصری حکومت نے اس کتاب کو ضبط کر لیا تھا۔ مصنف نے اس حکم کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی تو عدالت نے اس حکم کے خلاف فیصلہ دیا اور کتاب سے پابندی اٹھالی گئی۔ کتاب میں یہ پورے کا پورا فیصلہ بھی درج ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ جامع ازہر کی لجنۃ الفتوٰی کو شکایت یہ تھی کہ کتاب دین کے صریح مخالفانہ جذبے کے تحت لکھی گئی ہے اور اس کی کوشش یہ ہے کہ وہ دین کو اس کے مخصوص ترین وظیفۂ عمل سے یعنی یہ کہ وہ اجتماعی وسیاسی وقانونی امور کی نگرانی کرے، محروم کر دے۔ درآں حالیکہ کتاب اللہ اور سنت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ قطعی وواضح تصریحات موجود ہیں کہ اجتماعی زندگی کے تمام پہلوؤں پر خواہ وہ مالی وجنائی (جرائم کے متعلق) ہوں یا انفرادی، اجتماعی اور بین الاقوامی، اسے فعلی نگرانی حاصل ہے۔

کتاب "مِن ھُنا ... نبدأ" میں مصنف نے ان چار مسئلوں پر بحث کی ہے۔ (۱) ہمیں توہمات، جسے وہ "کہانت" کا نام دیتا ہے، چھوڑ کر خالص دین کی طرف آنا چاہیئے۔ (۲) مصر میں جو معاشی عدم مساوات حد سے بڑھی ہوئی ہے، اس کی ضروری اصلاح ہو۔ اس سلسلے میں اس نے زرعی اصلاحات اور تحدیدِ ملکیتِ زمین کی تجویز کی اور لکھا کہ اگر بڑے زمیندار کم از کم پچاس فدان (فدان تقریباً ایک ایکڑ کے برابر ہے) زمین کی ملکیت

کے لیے تیار نہیں، تو اس کی حد سو فدّا ن کر دی جائے۔ اس نے سُود ٹیکس کی بھی حمایت کی اور تحدید نسل یعنی خاندانی منصوبہ بندی کی ضرورت پر زور دیا۔ (۳) جماعت اخوان مسلمون جس قسم کی "دینی" حکومت کو بروئے کار لانے کی جدوجہد کر رہی تھی، اس کی مخالفت کی لیکن یہ تسلیم کیا کہ آج ہمارے معاشرے میں ایک عام رائے موجود ہے جس کے علمبردار دینی حکومت کا مطالبہ کرتے ہیں جو "بما انزل اللّٰہ" کے مطابق حکومت کرے اور زمین میں "حدود" کا نفاذ کرے، کیونکہ ان کے نزدیک ایک "حد" کا نفاذ لوگوں کے لئے اس سے کہیں بہتر ہے کہ ان کے ہاں چالیس دن بارش ہوتی رہے۔ (۴) یہ لکھا کہ ہم بحیثیت قوم ایک پھیپھڑے سے سانس لے رہے ہیں، کیونکہ ہم نے اپنی عورتوں کو سیاسی حقوق سے محروم کر رکھا ہے۔ مصنف کے نزدیک اگر عورتوں کو سیاسی حقوق مل جائیں تو وہ اُن زنجیروں کو، جن میں وہ گرفتار ہیں، ہٹا سکتی۔ اور وہ ظالمانہ فرق و امتیاز جو قوم کے دو حصّوں میں روا رکھا جاتا ہے اسے ختم کر سکتی ہیں

"دین نہ کہ توہمات" کے باب میں مصنف نے بہت سی ایسی باتیں لکھی ہیں، جن سے ہم فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مصر کے دینی حالات اور ہیں اور ہمارے اور ہمارے مقابلے میں مصر کو یہ فائدہ ضرور ہے کہ وہاں ہماری طرح مذہبی انارکی نہیں۔ پورے ملک کی دینی تعلیم جامع ازہر کی تحویل میں ہے۔ اور پاکستان کی طرح وہاں نہ ہر فرقے کے الگ الگ دینی مدارس ہیں اور نہ ایک فرقے ہی کے مختلف علماء نے اپنے اپنے مدرسے کھول رکھے ہیں۔ اسی طرح تمام مساجد کا انتظام وزارت اوقاف کرتی ہے، یہاں تک کہ وعظ و ارشاد کا بھی ایک مستقل شعبہ ہے، جس کا تعلق وزارت اوقاف سے ہے۔ لیکن اس سے مصر کو ایک نقصان بھی پہنچا اور وہ یہ کہ اس کی وجہ سے جامع ازہر تمام دینی امور کی "مصیطر" (داروغہ) بن گئی۔ اس نے ہر دینی اصلاح کا راستہ روکا۔ اور اس طرح وہ صدیوں تک جمود و رجعت پسندی کی محافظ بنی رہی۔

زمانۂ طالب علمی میں راقم السطور کو بعض مصریوں سے اکثر یہ سننے کا اتفاق ہوا کہ مصر اس وقت تین آفتوں میں گرفتار ہے۔ انگریز، بادشاہ اور ازہر۔ انگریز کا سہارا بادشاہ ہے اور بادشاہ کی قوت ازہر ہے۔ اور ازہر گڑھ ہے جمود کا۔ ازہر کے اسی جمود کے ردّ عمل کے طور پر مصر میں دو تحریکیں ابھریں۔ ایک دائیں بازو کی اخوان مسلمون اور دوسری سیکولرزم جس کے ڈانڈے بعض اوقات کمیونزم (اشتراکیت نہیں) سے جا ملتے ہیں۔ شیخ محمد عبدہ نے جو خود ازہری تھے، بیچ کی راہ اعتدال نکالنے کی بڑی کوشش کی، لیکن ازہری علماء کی ہیئت کبار نے جو اس کی نگران اعلیٰ ہے، ان کی نہ چلنے دی۔ اور ازہر کا شعار بدستور جمود رہا۔

مصنف اس باب میں لکھتے ہیں :۔ معاشرے اور دین کے باہمی تعلقات میں الجھاؤ نہ رہے تو یہ نقطہ آغاز ہوتا ہے اس راہ کا جو نمو و ترقی اور استقرار و ثبات کی طرف لے جاتی ہے۔ لوگوں کو ان کے دین سے متنفر کرنے والی کوئی ایسی چیز نہیں جیسی کہ یہ کہ دین کو ایسی صورت میں پیش کیا جائے کہ وہ ان کی نمو و ترقی میں رکاوٹ ڈالنے والی، ان کے حقوق کی مخالف اور ان کی آرزوؤں کو دبانے والی قوت ہو۔ دین معاشرہ انسانی کی ایک ایسی اجتماعی ضرورت کی نمائندگی کرتا ہے، جس سے انسان کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ دین مصدر و منبع ہو قوت و اخوت و مساوات کا، نہ کہ وہ پشت پناہ بنے انانیت اور ظلم و عدوان کا۔

اس کے بعد مصنف لکھتا ہے :۔ دین کا اپنی باعزت و اختیار مسند پر متمکن رہنا ان دو امور پر موقوف ہے۔ ایک :۔ لوگوں کی ضرورتوں اور زندگی سے اس کا برابر تعلق رہے اور وہ ان پر اثر انداز ہو تا کہ انسانیت اپنی ہر پیش آنے والی مشکل کے لئے اس سے اعانت حاصل کر سکے۔ دوسرے :۔ وہ اپنی عظیم ذاتی خصوصیات اور اپنے اصلی مقاصد کو جن کے لئے کہ اللہ نے اسے اتارا ہے، محفوظ رکھے۔ اور وہ ہیں لوگوں کو صحیح و باشرف مساوات کے دائرے میں حقیقی و واقعی سعادت سے بہرہ ور کرنا اور اس کی انہیں ترغیب دلانا۔

مصنف کہتے ہیں کہ آج ہم "دین کی طرف لوٹو" کی بلند آہنگ صدائیں سنتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ یہ لوگ کس دین کی طرف بلاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ دین کے نام سے بہت سے توہمات ہمارے ہاں فروغ پا چکے ہیں۔ ان حالات میں حکومتوں اور ان جماعتوں کے سامنے جو دین کا احترام کرتی ہیں اور اس کے بقا کی خواہش مند ہیں، سوائے اس کے اور کوئی صورت نہیں کہ وہ دین کو مروجہ توہمات سے الگ کرنے کی ہر ممکن تدبیر کریں اور اسے ان آلودگیوں سے پاک صاف کرنے کی سعی عمل میں لائیں۔

توہمات کا کیسے سدباب کیا جائے، اور دین کس طرح ان کے چنگل سے آزاد ہو؟ اس پر بحث کرنے کے بعد مصنف نے "مسجد و منبر" کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے :۔ اب وقت آگیا ہے کہ مسجد کے نظام کو ٹھیک کیا جائے۔ اس کے دائرۂ کار کی صحیح تنظیم ہو اور اس کے وسائل کو بہتر بنایا جائے۔ مغرب میں گرجے معاشرے کے ساتھ مل کر نہ کہ اس کے مخالف بن کر کام کرتے ہیں۔ وہ ترقی کو سراہتے ہیں، نہ کہ اس پر لعنت بھیجتے ہیں۔ وہ زندگی کی دعوت دیتے ہیں نہ کہ موت کی۔ وہ علم اور زمانے کے ساتھ ارتقائی منزلیں طے کر رہے ہیں اور فرد کی وہ تمام روحانی ضرورتیں پوری کرتے ہیں، جن سے وہ معاشرے کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کے قابل ہو۔ نہ وہ اس سے پیچھے رہے اور نہ وہ اس سے نفرت کرے۔

ایک زمانہ تھا کہ یہی گرجے اور ان کا کلیسائی نظام مغرب کی ہر قسم کی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی روک تھا۔ اس نے لوگوں کو زندہ جلایا، انہیں سخت سے سخت اذیتیں دیں۔ عقل پر پہرہ بٹھا دیا کہ وہ نہ سوچے۔ علم کے تمام سرچشمے بند کر دیئے تاکہ اس کے مقرر کردہ عقائد پر کوئی آنچ نہ آئے۔ کلیسائی نظام نے یہ سب کچھ کیا، لیکن آخر میں اسے شکست فاش ہوئی۔ اور بقول علامہ اقبال پیر کنشت یعنی پاپائے اعظم کی عصمت حرفِ غلط بن گئی۔ اور اس طرح فکر کی کشتی نازک رواں ہوئی لیکن کلیسا اس دھکے سے سنبھلا اور پروٹسٹنٹ فرقے کے علاوہ جس نے کہ پاپائے اعظم کے خلاف بغاوت کی تھی، خود پاپائے اعظم کا کیتھولک فرقہ بہت کچھ بدل گیا، اور اب اس کا کلیسائی نظام دینی امور کے ساتھ ساتھ بہت سی تعلیمی، اجتماعی اور فلاحی خدمات بھی انجام دیتا ہے۔

اسلام کے ظہور اقبال میں مسجد عبادت گاہ بھی تھی۔ تعلیم و تدریس کے لئے مدرسہ بھی اور اجتماعی سرگرمیوں کا مرکز بھی۔ جمعہ کا اجتماع رابطہ عوام کا سب سے موثر ذریعہ تھا۔ اور اس میں جو خطبہ دیا جاتا تھا، وہ ایک لحاظ سے ان امور میں جو بالفعل لوگوں کے سامنے ہوتے، ان کی رہنمائی کرتا تھا۔ شروع میں جو خود خلیفہ اور دوسرے شہروں میں اس کے مقرر کردہ والی و عامل ہی خطبۂ جمعہ دیا کرتے تھے، تو اس کا یہی مطلب تھا کہ لوگ امورِ پیش نظر سے باخبر رہیں۔ اور ان کے بارے میں مسلمانوں کو صحیح ہدایت ملتی رہے۔

"من هنا ... نبدأ" کا مصنف اس ضمن میں مصر کی جو صورت حال ہے، وہ ان الفاظ میں پیش کرتا ہے:-

"ہمارے ہاں منبر ایک منفی اور تباہ کن کردار ادا کرتے ہیں۔ ان پر کھڑے ہو کر بولنے والے خطیبوں کا ۱۰/۹ حصہ اپنے اس منصب تک سے بے خبر ہے، جس کا بجا لانا ان پر فرض ہے۔ تم انہیں دیکھو گے کہ وہ فقر کا علاج فقر سے کرتے اور بدی کو بدی سے مٹاتے ہیں۔ وہ لوگوں کو معاشرے سے بدظن کرتے اور انہیں اس کے خلاف ابھارتے ہیں۔ کیونکہ ان کی نظر میں معاشرہ فسق و فجور اور الحاد و گمراہی میں مبتلا ہے اس لئے وہ کسی احترام و عزت کا مستحق نہیں"

مصنف لکھتا ہے کہ ان خطباء میں سے بہت سے ایسے بھی ہیں، جو منبر پر کھڑے ہو کر اقتصادی، سیاسی اور اجتماعی امور پر جنہیں وہ سمجھتے تک نہیں ان کی تنقید تو ایک طرف رہی، رائے زنی کرتے ہیں۔ اور ایسے ہی وہ ہر اس نئے قدم اور نئی چیز پر برستے ہیں، جس کے کہ وہ عادی نہیں ہوتے۔ مصنف نے یہاں ایک بڑے محترم شیخ کا ذکر کیا ہے جس نے مصری فوج کے اس اقدام پر کہ اس نے ترکی ٹوپی کے بجائے نئے طرز کی ٹوپی اختیار کر لی، جمعہ کا خطبہ دیتے ہوئے یہ الفاظ کہے تھے: "سب تعریف اللہ کی ہے جس نے ہمیں شیطان سے ہر معاملہ میں چوکنا رہنے کا حکم دیا ہے۔ اور اسی لئے اس نے ہمارے لئے "برنیطہ" (یورپی ٹوپی) پہننا حرام قرار دیا۔"

مصنف دین کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے :۔ دین اپنی طبیعت اور طریقۂ کار کے اعتبار سے انسانیت کا طرفدار ہے۔ اور اس کا اظہار دین کی اس دعوت سے ہوتا ہے کہ اس میں بنی آدم کی تکریم اور آسمان و زمین اور جو کچھ کہ ان کے درمیان ہے، اس کی تسخیر پر زور دیا گیا ہے۔ دین کا رجحان "ڈیموکراٹی" ہے۔ وہ انسانی برادری میں مصنوعی امتیازات کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ انسانوں کو اس طرح مخاطب کرتا ہے۔ "یا ایّھا الناس۔۔۔۔" اور اللہ جل جلالہٗ بندوں کو یوں خطاب فرماتا ہے۔ "یا عبادی۔۔۔۔" دین عقل کا احترام کرتا ہے، اور اسی کو سزا و جزا کا ذریعہ گردانتا ہے۔ اسی لئے وہ بحث و مناقشہ کی پوری آزادی دیتا ہے۔ بے شک دین حق یہ جانتا ہے کہ عقل وہ پھیپھڑا ہے، جس سے کہ وہ سانس لیتا ہے۔ چنانچہ ہم قرآن مجید کو دیکھتے ہیں کہ اس نے صدہا آیتوں میں لوگوں کو اس پر ابھارا ہے کہ وہ اس پھیپھڑے کو برابر استعمال کریں۔ دین زندگی کو مانتا اور اس سے محبت کرتا ہے اور اس کے نزدیک زندگی کی ذمہ داریوں سے فرار بہت بڑا جرم ہے۔ دین زندگی اور علم کا ساتھ دیتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ اس کی توانائی منحصر ہے اس کے مسلسل ارتقاء پر کیونکہ جب علم و فکر برابر آگے بڑھ رہا ہے تو دین کیسے جامد رہ سکتا ہے۔

یہ ہیں دین حق کی خصوصیات۔ مصنف لکھتے ہیں کہ اب ضرورت اس کی ہے کہ دین کی اس حقیقت اصلی کا عوام کو "انجکشن" دیا جائے تاکہ وہ ہر متعدی روگ کا مقابلہ کر سکیں۔ اس کے لئے ایک تو مدارس کا دینی نصاب ایسا ہونا چاہیئے کہ اس سے یہ مقصد پورا ہو سکے۔ دوسرے مسجدوں اور منبروں سے صحیح کام لیا جائے۔ اس بارے میں مصنف لکھتے ہیں :۔ "جب کہ ہمیں نئی دینی ثقافت کی ضرورت ہے، تو اس کے لئے لازمی ہے کہ واعظوں اور ائمہ مساجد کی ایک نئی نسل پیدا کرنے کے لئے کچھ کیا جائے۔ آج ازہری نفسیاتی اور ذہنی لحاظ سے اس امر کی پوری استعداد رکھتے ہیں کہ وہ اس نئی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ اس ضمن میں ازہر کے شیوخ (اساتذہ) کا صرف یہ کام ہے کہ وہ اس کے لئے ایسا جدید نصاب اور علمی منہاج مرتب کریں جو نئے شعور اور نئی بیداری کا ساتھ دے سکے اور اس طرح جدید مصر اور جدید مشرق کو وجود میں لانے میں مدد دے۔ اب اگر شیوخِ ازہر اس کے لئے تیار نہیں، یا وہ اس کی استعداد نہیں رکھتے تو یہ فرض حکومت پر عائد ہوتا ہے کہ وہ موجودہ اور آئندہ بننے والی یونیورسٹیوں میں سے ہر یونیورسٹی میں علومِ دینی کا ایک ایک کالج قائم کرے جہاں صحیح اصولوں پر علوم دینی کی تعلیم ہو جو کہ ترقی خواہ دینی زندگی کی طرف رہنمائی کرے اور اس طرح دینی تقدم و ارتقاء کی قوتوں کا وسیلہ اور سہارا بن سکے۔ جدید یونیورسٹیوں کے ان کالجوں سے نئی طرز کے واعظ نکلیں جیسے کہ یورپ میں مسیحی گرجوں کے واعظ ہوتے ہیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ علمائے راشدین کو اس پر آمادہ کیا جائے کہ وہ دین کے تمام مسائل کو نئے سرے سے جامع و تخلیقی نظر سے دیکھیں۔"

مصنف کا کہنا ہے کہ اگر یہ صحیح ہے کہ افکار فوجی لشکروں سے زیادہ قوی ہوتے ہیں تو حکومت کا فرض ہے کہ وہ توہمات کے سدباب کے لئے مثبت قدم اٹھائے۔ وہ ایک "مجمع العلماء" قائم کرے جو دینی مسائل کو نئے انداز سے پیش کرنے کا ذمہ لے۔ اس کی طرف سے کتابیں شائع ہوں۔ اس "مجمع العلماء" میں وسیع افقِ ذہنی کے مالک علماءِ دین کے ساتھ ساتھ اربابِ فکر و ادب و اجتماع میں سے منتخب افراد بھی شرکت کریں۔

اس سلسلے میں مصنف کے خیال میں خطباتِ جمعہ سے بڑا کام لیا جا سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ان کی بڑی تاثیر ہوتی ہے اور وہ نمازیوں کے دلوں میں بڑا گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ بقول ان کے اکثر منبروں کے خطبے لوگوں کے ذہنوں میں گہری خندقیں چھوڑ جاتے ہیں۔ اس کے لئے ایک تو چھوٹی چھوٹی مسجدوں میں الگ الگ نماز جمعہ پڑھنے کے بجائے اسے صرف بڑی مسجدوں تک محدود کر دیا جائے۔ اور وہاں ہر منبر کے لئے ایسا خطیب ہو جو وسیع الذہن اور صحیح ادراک رکھنے والا ہو اور وہ اپنے خیالات کو اچھی طرح پیش کر سکتا ہو۔ ان خطیبوں کے لئے بھی وقتاً فوقتاً ریفریشنگ کورس ہوں۔ باقی جہاں تک دیہات کے خطباء کا تعلق ہے، ان کے لئے تیار شدہ خطبے ہونے چاہئیں جو ہر ماہ انہیں بہم پہنچائے جائیں۔

یہ جو کچھ لکھا گیا، ظاہر ہے یہ سب مصر سے اور وہ بھی آج سے اٹھارہ سال پہلے کے مصر سے متعلق ہے۔ یقیناً اس میں ہمارے لئے عبرت بھی ہے اور سبق بھی۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، ازہر کی وجہ سے اگر مصر کو بہت سے فائدے پہنچے تو اس سے بہت سے نقصان بھی اسے اٹھانے پڑے۔ برصغیر پاک و ہند میں برطانوی تسلط کے بعد سے تقریباً دو سو سال تک دینِ اسلام کی بقا و ترقی، دینی تعلیم کے فروغ اور دوسری دینی سرگرمیوں کا تمام تر انحصار عوام مسلمانوں کے جذبہ ایمان و عمل پر رہا، اور ازہر کے کروڑوں روپے کے اوقاف کی طرح یہاں ان کاموں کے لئے کوئی اوقاف نہ تھے۔ اس سے دینی کام کرنے والوں کو یقین و اخلاص کی وہ دولت ملی، جس سے مصر کے مستقل مفادات رکھنے والے دینی طبقے محروم رہے۔ اس سلسلے میں ہمارے نامور علماء سرِفہرست آتے ہیں، جن کی کوششوں سے برصغیر کا کونہ کونہ لا الٰہ الا اللہ محمدٌ رسول اللہ کی صداؤں سے گونج اٹھا، اور کوئی قصبہ اور گاؤں ایسا نہ رہا جس میں علم دین پڑھانے والے مولوی اور عالم نہ پہنچے ہوں۔ برصغیر کی یہ دو سو سال کی جو ہماری انتہائی سیاسی و اقتصادی نکبت کا دور رہے، دینی تاریخ بڑی ہی شاندار ہے۔ اور اس کے لئے ہم اپنے محترم بزرگوں کے تا ابد احسان مند رہیں گے۔

ازہر جیسی کسی دینی محیطِ کل درس گاہ نہ ہونے کا ایک بڑا فائدہ ہمیں یہ ہوا کہ ہمارے ہاں کسی قسم کی مذہبی اجارہ داری قائم نہ ہو سکی کہ اس سے اختلاف حکومت کے قانون کے زور سے اسلام سے خروج قرار دیا

جاتا۔ اور اس طرح اختلاف رائے کے تمام دروازے بند ہوجاتے۔ اسی مذہبی اجارہ داری نہ ہونے کا نتیجہ تھا کہ پچھلی صدی ڈیڑھ صدی میں ہمارے ہاں کئی مذہبی تحریکیں اٹھیں، اور انہیں اپنے خیالات کی اشاعت کے لئے قدرے آزاد ماحول میسّر آیا۔ بے شک اس کا ایک نقصان یہ ہوا کہ ہمارے ہاں فرقہ پرستی زور پکڑ گئی۔ اور ہر فرقہ دوسرے فرقے سے بھڑ گیا، لیکن اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ مذہبی ذہنی جمود ٹوٹا اور لوگوں میں جراءت افکار پیدا ہوئی۔ اب اگر مختلف فرقے خود کو اسلام کے مختلف مکاتب فکر مان لیں اور ایک دوسرے کی تفسیق و تکفیر چھوڑ دیں، تو اس سے ہماری قومی زندگی میں وسعت اور گہرائی دونوں پیدا ہوسکتی ہیں۔

یہ تو سب کچھ ہوا، لیکن اصل بات یہ ہے کہ دو صدی پہلے ہماری دینی درس گاہوں میں جو نصاب تعلیم تھا، وہ دینی علوم کے ساتھ اس وقت کے دنیوی علوم پر بھی پوری طرح حاوی تھا۔ اور ان درس گاہوں کا فارغ التحصیل معلّم و خطیب بھی ہوسکتا تھا اور سرکاری عہدے دار بھی۔ اب ایک تو اس طویل عرصے میں دینی درس گاہوں کے نصاب سے دنیوی علوم کا حصّہ بتدریج کم ہوگیا۔ دوسرے وہ جدید علوم کے مقابلے میں بے کار ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے علماءِ دین دینی علوم میں دستگاہِ کامل رکھتے ہوئے آج کے دنیوی علوم میں بہت پیچھے ہیں۔ حالانکہ ایک زمانے میں وہ ان ہر دو علوم میں پیش پیش ہوتے تھے۔

ہمارے ہاں کی دینی زندگی کا یہ سب سے بڑا مسئلہ ہے، جسے جلد حل ہونا چاہیئے۔

"مسجد و منبر" میں اس وقت ہمارے ہاں یہ جو انارکی اور خلفشار ہے کہ منبروں سے جو جی میں آتا ہے کہا جاتا ہے اور دینی مسائل کے علاوہ سیاست، اقتصادیات اور اجتماعیات کا کوئی مسئلہ نہیں، جسے سمجھے بغیر اس کے متعلق سادہ دل اور عقیدت مند نمازیوں کو غلط اور گمراہ کن تصور نہیں دیا جاتا، اسے ختم کئے بغیر جمہور کی صلاحیتوں کو تعمیری راہوں پر ڈالنا ناممکن ہے۔ ایک حکومت جس کو واقعی اپنے عوام کی فلاح و بہبود کی فکر ہے اور وہ سمجھتی ہے کہ وہ اس معاملے میں تاریخ کے سامنے جواب دہ ہے "مسجد و منبر" کے موجودہ خلفشار سے کبھی چشم پوشی نہیں کر سکتی۔ بے شک صدر ایوب کی حکومت نے یہ بڑا کام کیا کہ دنیا جہاں کے دوسرے مسلمان ملکوں کی طرح یہاں بھی محکمہ اوقاف کو اس امر کا مختار بنایا کہ وہ "مسجد و منبر" کو کسی ضابطے میں لائے لیکن ایک تو خود یہ اقدام ادھورا ہے، دوسرے جب تک دینی تعلیم کا نصاب نہیں بدلا جاتا، اور کسی نہ کسی حد تک دینی مدارس پر کنٹرول نہیں ہوتا، محکمہ اوقاف کی کوششیں زیادہ سود مند ثابت نہیں ہوں گی۔

یہ توقع کہ اصلاح از خود ہوجائے گی، محض خوش فہمی ہے۔ ہر مسلمان حکومت کو ایک نہ ایک وقت یہ قدم اٹھانا پڑتا ہے۔